اسلامی نظامِ تعلیم

اور

پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

[یہ وہ تقریر ہے جو اسلامی جمعیتہ طلبہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ۵ ارفروری ۵۲ء کو برکت علی محمڈن ہال لاہور میں کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث اب تک اسے اشاعت کی خاطر مرتب کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے اسے اتنی تاخیر کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے]

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

جناب صدر! اور حاضرین و حاضرات!!

جس مسئلے پر مجھے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کرنا ہے وہ یہ ہے کہ "اسلامی نظامِ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کی عملی صورت کیا ہے؟" میں نے اپنی تقریر کے لیے یہ موضوع اختیار نہیں کیا ہے کہ "اس ملک میں کونسا نظامِ تعلیم جاری ہو؟" اس لیے کہ یہ مملکت اسلام ہی کے نام پر بنائی گئی ہے اس کے قیام کا مطالبہ ہی اسلام پر مبنی تھا، اس کے متعلق اول روز سے کہا جاتا رہا ہے کہ ہم ایک الگ خطۂ زمین اس لیے چاہتے ہیں کہ اس میں اسلامی تہذیب اور اسلامی نظامِ زندگی کو از سرِ نو زندہ اور قائم کیا جائے، اور تقدیرِ الٰہی بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے لازماً اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بننا ہے اس لیے اب یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ کس قسم کا نظامِ تعلیم اس ملک میں رائج ہو۔ بلکہ یہ امر طے شدہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں اسلامی نظامِ تعلیم ہی کو رائج ہونا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز زیرِ بحث ہونی چاہیے اور ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ تعلیم کو اسلام کے سانچوں میں ڈھالنے کے

لیے کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔

تاہم یہ بات مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس مملکت کے قیام کے چار ساڑھے چار سال بعد آج تک ہمارے ہاں یہی مسئلہ زیر بحث ہے کہ تعلیم کو کس طرح اسلامی سانچوں میں ڈھالا جائے۔ یہ کام تو مملکت کے قیام کے بعد سب سے پہلے کرنے کا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا میں کوئی مملکت بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک کہ وہ اپنے چلانے والوں کو تربیت دینے کا اور ان کو اپنے مقصد اور اپنے مدعا کے مطابق تیار کرنے کا انتظام نہ کرے۔ اس لحاظ سے حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے لیے بنیادی مسائل میں سے ہے، اور یہ ایسی چیز تھی کہ ملک کے قیام کے بعد اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے تھی۔ لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ چار ساڑھے چار سال کے بعد بھی کوئی آثار ہمیں ایسے نظر نہیں آتے کہ کسی نے نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کے متعلق کچھ بھی سوچا ہو۔ عملی اقدامات تو درکنار ہمیں سوچنے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔

بہرحال اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ لوگ آگے بڑھیں اور بڑھ کر ان کو بتائیں کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم کس حد تک، کس طرح اور کس کس حیثیت سے ہمارے اس مقصد کی ضد پڑ رہا ہے جس کے لیے ہماری یہ مملکت قائم ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کو یہ بھی بتائیں کہ اگر نظامِ تعلیم کو اس مقصد کے مطابق ڈھالنا ہے تو کس طرح ڈھالا جائے، اس کی عملی صورت کیا ہے اور اس کا نقشہ کیا ہونا چاہیے۔ اسی خدمت کو انجام دینے کے لیے میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں اور دوسرے جو لوگ بھی اس طرح کی فکر رکھنے والے ہیں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی اس فرض کو انجام دیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن نقائص کو اچھی طرح سمجھ لیں جو ہمارے نظامِ تعلیم میں اس وقت پائے جاتے ہیں۔ جب تک ہم یہ بات نہ جان لیں کہ جو چیز اس وقت موجود ہے اس میں کیا خرابی ہے، ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اس میں اصلاح کس طرح اور کس شکل میں ہونی چاہیے۔ ہمارے ملک میں اس وقت دو طرح کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ ایک نظامِ تعلیم ہمارے پرانے طرز کے مدارس میں رائج

ہے جو ہماری مذہبی ضروریات پوری کرنے کے لیے علماء تیار کرتا ہے ، اور دوسرا نظامِ تعلیم وہ ہے جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اور وہ مذہبی دائرے سے باہر ہمارے پورے نظامِ زندگی کو چلانے کے لیے کارکن تیار کرتا ہے ۔ میں ان دونوں کے نقائص آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کروں گا۔

قدیم نظامِ تعلیم جہاں تک ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے ۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے ، اُس وقت جو نظامِ تعلیم ہمارے مُلک میں رائج تھا وہ ہماری اُس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا ۔ اُس نظامِ تعلیم میں وہ ساری چیزیں پڑھائی جاتی تھیں جو اس وقت کے نظامِ مملکت کو چلانے کے لیے درکار تھیں ۔ اُس میں صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں تھی بلکہ اس میں فلسفہ بھی تھا ، اس میں منطق بھی تھی ، اُس میں ریاضی بھی تھی ، اس میں ادب بھی تھا اور دوسری چیزیں بھی تھیں ۔ اُس زمانے کی سول سروس کے لیے جس طرح کے علوم درکار تھے وہ سب طلبہ کو پڑھائے جاتے تھے لیکن جب وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے تو اس پورے نظامِ تعلیم کی افادیت ختم ہوگئی ۔ اُس نظامِ تعلیم سے نکلے ہوئے لوگوں کے لیے نئے دَور کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں رہی جس قسم کے علوم اِس دوسری مملکت کو درکار تھے وہ اس کے اندر شامل نہیں تھے ۔ اور جو علوم اس میں شامل تھے اُن کے جاننے والوں کی اِس دوسری مملکت کو کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ تاہم چونکہ اُس کے اندر ہماری صدیوں کی قومی میراث موجود تھی اور ہماری مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی اس کے اندر کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا (اگرچہ کافی نہ تھا) اس لیے اس زمانے میں ہماری قوم کے ایک اچھے خاصے بڑے عنصر نے یہ محسوس کیا کہ اس نظام کو جس طرح بھی ہو سکے قائم رکھا جائے ۔ تاکہ ہم اپنی آبائی میراث سے بالکل منقطع نہ ہو جائیں ۔

اس غرض کے لیے انہوں نے اس کو جوں کا توں قائم رکھا ۔ لیکن جتنے جتنے حالات بدلتے گئے اتنی ہی زیادہ اس کی افادیت گھٹتی چلی گئی ، کیونکہ اس نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ تعلیم پاکر نکلے اُن کو وقت کی زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی ۔ اب جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پاکر نکل رہے ہیں اُن کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری

مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں، یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اس طرح ان کی ذات سے اگرچہ کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہمیں پہنچتا ہے۔ یعنی ان کی بدولت ہمارے اندر قرآن و دین کا کچھ نہ کچھ علم پھیلتا ہے، دین کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اور ہماری مذہبی زندگی میں کچھ نہ کچھ حرارت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اس فائدے کے مقابلے میں جو نقصان ان سے ہم کو پہنچ رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں، نہ اُن کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کچھ کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آ رہی ہے۔ پھر اُن کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا، کیونکہ اُن کی ضروریات زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔

یہ ہے ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کی پوزیشن۔ اور یہ بھی میں وضاحت کے ساتھ کہدوں کہ حقیقت میں وہ دینی تعلیم بہت کم ہے۔ دراصل وہ اب سے دو ڈھائی سو برس پہلے کی سول سروس کی تعلیم ہے جس میں زیادہ تر اس وجہ سے دینی تعلیم کا جوڑ لگایا گیا تھا کہ اس زمانے میں اسلامی فقہ ہی ملک کا قانون تھی اور اسے نافذ کرنے والوں کے لیے فقہ اور اس کی بنیادوں کا جاننا ضروری تھا۔ آج ہم غنیمت سمجھ کر اُسی کو اپنی دینی تعلیم سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس کے اندر دینی تعلیم کا عنصر بہت کم ہے۔ کوئی عربی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے نصابِ تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل ہو۔ صرف ایک یا دو سورتیں (سورۂ بقرہ یا سورۂ آلِ عمران) باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں۔ باقی سارا قرآن اگر کہیں شاملِ درس ہے بھی تو صرف اس کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ تحقیقی مطالعۂ قرآن کسی مدرسے

کے نصاب میں بھی شامل نہیں۔ یہی صورت حال حدیث کی ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم جیسی کہ ہونی چاہیئے جیسی کہ محدث بننے کے لیے درکار ہے، کہیں نہیں دی جاتی۔ درس حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آجاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیے جاتے ہیں۔ باقی رہیں وہ حدیثیں جو دین کی حقیقت سمجھاتی ہیں، یا جن میں اسلام کا معاشی اور سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی نظام بیان کیا گیا ہے، یا جن میں دستورِ مملکت، یا نظامِ عدالت یا بین الاقوامی قانون پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان پر سے استاد اور شاگرد دونوں اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابلِ توجہ ہے ہی نہیں۔ حدیث اور قرآن کی بہ نسبت ان کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ ہے، لیکن اس میں زیادہ تر، بلکہ تمام تر جزئیاتِ فقہ کی تفصیلات ہی توجہات کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ، اس کے تدریجی ارتقاء، اس کے مختلف اسکولوں کی امتیازی خصوصیات، ان اسکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول، اور ائمہ مجتہدین کے طریقِ استنباط، جن کے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہ نہیں بن سکتا، ان کے درس میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں، بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار، استاد بھی نگاہ نہیں رکھتے۔

اس طرح یہ نظامِ تعلیم ہماری اُن مذہبی ضروریات کے لیے بھی سخت ناکافی ہے جن کی خاطر اس کو باقی رکھا گیا تھا۔ رہیں دنیوی ضروریات تو ان سے تو اس کو سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

جدید نظامِ تعلیم اس کے بعد اُس نظامِ تعلیم کو لیجیے جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا۔ دنیا میں جو نظامِ تعلیم بھی قائم کیا جائے، اس میں اوّلین بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی تیار کرنا چاہتے ہیں اور آدمیت کا وہ کیا نقشہ آپ کے سامنے ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو تعلیم و تربیت دے کر ڈھالنا چاہتے ہیں؟ اس بنیادی سوال کے لحاظ سے آپ دیکھیں تو یقیناً انگریز کے سامنے انسانیت کا وہ نقشہ ہرگز نہیں تھا جو مسلمانوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ انگریز نے یہ نظامِ تعلیم یہاں اس لیے قائم نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کی کلچر کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے کارکن تیار کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اس کے پیشِ نظر نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اس کے پیشِ نظر انسانیت کا وہ نقشہ بھی نہیں تھا جو خود اپنے

ملک انگلستان میں اس کے پیشِ نظر تھا۔ وہ اُس مقصد کے لیے یہاں آدمی تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ اپنے ملک میں اپنی قوم کے لیے تیار کرتا تھا۔ وہ یہاں ایسے لوگ تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جو ایک آزاد قومی حکومت کو چلانے کے لیے موزوں ہو۔ یہ چیز تو وہ اپنے ملک میں چاہتا تھا نہ کہ آپ کے ملک میں۔ آپ کے ملک میں جیسے آدمی تیار کرنا اس کے پیشِ نظر تھا وہ یہ تھا کہ وہ باہر کی ایک مٹھی بھر قوم کو جو اُن کے ملک میں آکر حکومت کر رہی تھی، حکومت چلانے میں مدد دیں۔ اس کو ایسے آدمی درکار تھے جو اس کی زبان سمجھتے ہوں، جن سے وہ ربط اور تعلق رکھ سکے اور کام لے سکے، جو اُس کے اُن اصولوں کو جانتے اور سمجھتے ہوں جن پر وہ ملک کا نظام چلانا چاہتا تھا، اور جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اس کے آلۂ کار بن سکیں۔ یہ مقصد اس کے سامنے تھا اور اس مقصد ہی کے لیے اس نے یہ نظامِ تعلیم رائج کیا۔

بے خدا تعلیم | اس نظامِ تعلیم میں اس نے جتنے علوم پڑھائے، اُن میں اسلام کا کوئی شائبہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ خود یورپ میں اُن سارے علوم کا جو ارتقاء ہوا تھا وہ تمام تر خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی رہنمائی میں ہوا تھا۔ جو مذہبی طبقہ وہاں موجود تھا، وہ پہلے ہی فکر و عمل کے میدان سے بے دخل کیا جا چکا تھا۔ اس لیے تمام علوم کا ارتقاء، خواہ وہ سائنس ہو، خواہ وہ فلسفہ ہو، خواہ تاریخ ہو، خواہ عمرانیات ہو، ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو اگر خدا کے منکر نہ تھے تو کم از کم اپنی دنیوی زندگی میں خدا کی رہنمائی کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہ کرتے تھے۔ انگریز نے اپنے انہی علوم کو لا کر، انہی کتابوں کے ساتھ آپ کے اس ملک میں رائج کیا اور آج تک انہی علوم کو اُسی طرز پر یہاں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ پڑھتے رہے اُن کا ذہن قدرتی طور پر بغیر اپنے کسی قصد اور اپنے کسی ارادے کے آپ سے آپ اس طرح بنتا چلا گیا کہ وہ دین سے، اور دینی نقطۂ نظر سے، اور دینی اخلاق سے، اور دینی فکر سے روز بروز بعید تر ہوتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی تعلیم کے نقطۂ آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تعلیم تک دنیا کے متعلق جتنی معلومات بھی حاصل کرے وہ ساری کی ساری خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی ہوں، اُس کے ذہن میں آخر خدا کا اعتقاد کیسے جڑ پکڑ سکتا ہے۔ اس کی درسی کتابوں میں خدا کا کہیں ذکر ہی نہ ہو۔ وہ تاریخ پڑھے تو اس میں پوری انسانی زندگی اپنی قسمت آپ ہی بناتی اور بگاڑتی نظر آئے۔ وہ فلسفہ پڑھے تو اس

میں کائنات کی گتھی خالقِ کائنات کے بغیر سلجھانے کی کوشش ہو رہی ہو۔ وہ سائنس پڑھے تو اس میں سارا کارخانۂ ہستی کسی صانعِ حکیم اور ناظم و مدبّر کے بغیر چلتا ہوا دکھایا جائے۔ وہ قانون، سیاست، معیشت اور دوسرے علوم پڑھے تو ان میں سرے سے یہ امر زیرِ بحث ہی نہ ہو کہ انسانوں کا خالق اُن کے لیے زندگی کے کیا اصول اور احکام دیتا ہے، بلکہ اُن سب کا بنیادی نظریہ ہی یہ ہو کہ انسان آپ ہی اپنی زندگی کے اصول بنانے کا حق رکھتا ہے۔ ایسی تعلیم پانے والے سے کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ تو خدا کا انکار کر۔ وہ آپ سے آپ خدا سے بے نیاز اور خدا سے بے فکر ہوتا چلا جائے گا۔

اخلاق سے خالی تعلیم | یہ تعلیم خدا پرستی اور اسلامی اخلاق سے تو خیر خالی ہے ہی، مگر غضب یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے نوجوانوں میں وہ بنیادی انسانی اخلاقیات تک پیدا نہیں کرتا جن کے بغیر کسی قوم کا دنیا میں ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔ اس کے زیرِ اثر پرورش پا کر جو نسلیں اٹھ رہی ہیں وہ مغربی قوموں کے عیوب سے تو ماشاء اللہ پوری طرح آراستہ ہیں، مگر ان کی خوبیوں کی چھینٹ تک ان پر نہیں پڑی ہے۔ ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی و جفاکشی، نہ ضبطِ اوقات، نہ صبر و ثبات، نہ عزم و استقلال، نہ باقاعدگی و باضابطگی، نہ ضبطِ نفس، نہ اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری۔ وہ بالکل خودرَو درختوں کی طرح ہیں جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی قومی کیرکٹر بھی ہے۔ ان کو معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خوار، خویش پرور، سفارشیں کرنے اور سننے والے، بلیک مارکٹنگ کرنے اور کرانے والے، ناجائز درآمد و برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور قانون اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر چھری چلانے والے، اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کر دینے والے، ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آتے ہیں۔ انگریز کے ہٹ جانے کے بعد مملکت کو چلانے کی ذمّہ داری کا بار اسی تعلیم کے تیار کیے ہوئے لوگوں نے سنبھالا ہے، اور چار پانچ سال ہی کے اندر ان بے سیرت کارکنوں کے ہاتھوں ملک کا جو حال ہوا ہے وہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ اور جو نسل اب ان تعلیم گاہوں میں پرورش پا رہی

ہے اس کے اخلاق و کردار کا حال آپ جب چاہیں درسگاہوں میں، ہوسٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور قومی تقریبات کے موقع پر بازاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس تعلیم میں خدا پرستی اور اسلامی اخلاق نہ سہی، آخر وہ اخلاق کیوں نہیں پیدا ہوتے جو انگریزوں میں، جرمنوں میں، امریکیوں میں اور دوسری ترقی یافتہ مغربی قوموں میں پیدا ہوتے ہیں؟ ان کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات تو بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں۔ یہاں وہ بھی مفقود ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی انسانی اخلاقیات پیدا کرنے کی فکر وہ نظامِ تعلیم کرتا ہے جو ایک آزاد قوم اپنے آزاد نظامِ زندگی کو چلانے کے لیے بناتی ہے۔ اس کو لامحالہ اپنے تمدن کے بقا اور ارتقاء کی خاطر ایسے کارکن تیار کرنے کی فکر ہوتی ہے جو مضبوط اور قابلِ اعتماد سیرت کے مالک ہوں۔ انگریز کو ایسے کارکنوں کی ضرورت اپنے ملک میں تھی نہ کہ آپ کے ملک میں۔ آپ کے ملک میں تو انگلستان کے برعکس اسے وہ اخلاق پیدا کرنے مطلوب تھے جو غلاموں میں ہونے چاہئیں۔ جو ان لوگوں میں ہونے چاہئیں جو اپنے ہاتھوں اپنے ہی ملک کو فتح کر کے اپنی قوم کے دشمنوں کے حوالے کر دیں اور پھر اپنے ملک کا نظم و نسق اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے چلا سکیں۔ اس کام کے لیے جیسے اخلاقیات کی ضرورت تھی ویسے ہی اخلاقیات انگریزوں نے یہاں پیدا کرنے کے لیے وہ تعلیمی مشینری بنائی جو آج تک جوں کی توں اسی شان سے چل رہی ہے۔ اس مشین سے ایک آزاد ملک کے لیے مضبوط پرزے ڈھلنے کی اگر کوئی شخص توقع رکھتا ہے تو اسے پہلے اپنی عقل کے ناخن لینے کی فکر کرنی چاہیے۔

جدید تعلیم کے ساتھ دینیات کا جوڑ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جب یہ نظامِ تعلیم ملک میں رائج ہوا اور ترقی و خوشحالی کے تمام دروازے اُن لوگوں کے لیے بند کر دیے گئے جو یہ تعلیم حاصل نہ کریں، تو ہماری قوم کے صاحبِ فکر و تدبیر لوگوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ نظامِ تعلیم ہماری نئی نسلوں کو بالکل ہی نامسلمان بنا کر نہ رکھ دے۔ اس لیے انہوں نے چاہا کہ اسی نظام کے تحت خود اپنے اہتمام میں قومی مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کریں جن میں طلبہ کو پڑھایا تو وہی کچھ جائے جو سرکاری

درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے، اور انہیں تیار بھی اسی کام کے لیے کیا جائے جس کے لیے انگریز انہیں تیار کرنا چاہتا ہے، مگر ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم کا جوڑ بھی لگا دیا جائے، تاکہ وہ بالکل کافر ہی ہو کر نہ رہ جائیں۔

یہ ایک اصلاح کی تجویز تھی اور خیال یہ کیا گیا تھا کہ اس طریقے سے ہم اُن مسلمان نوجوانوں کو جو ہمارے اداروں میں آکر پڑھیں گے، اُن بُرے اثرات سے کسی نہ کسی حد تک بچا سکیں گے جو انگریزی تعلیم سے پہنچنے کی توقع تھی۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا، اور عقل سے بھی آپ سوچیں تو یہی آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ اس طرح کے قلم لگانے سے حقیقت میں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ پیوندی انسان تیار کرنے کی ایک عجیب کوشش تھی جو قطعاً ناکام ثابت ہوئی اور قانونِ فطرت کے مطابق اس کو ناکام ہونا ہی چاہیے تھا۔

ایک طرف آپ ایک طالب علم کو تمام دنیوی علوم اِس طریقے سے پڑھاتے ہیں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سارا کارخانہ بے خدا ہے اور خدا کے بغیر چل رہا ہے اور خوب کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ جو علم بھی وہ پڑھتا ہے اس کے اندر کہیں اس کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اِس کارخانۂ دنیا میں یا اس کارخانۂ زندگی میں کہیں خدا کا کوئی مقام ہے، کہیں رسول کا کوئی مقام ہے، کہیں وحی کی کوئی حاجت ہے۔ سارے کے سارے نظامِ زندگی کو وہ اِسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد یکایک آپ دینیات کی کلاس میں لے جا کر اس کو بتاتے ہیں کہ خدا بھی ہے اور رسول بھی ہے اور وحی بھی آتی ہے اور کتابیں بھی آتی ہیں۔ آپ خود غور کیجیے کہ دنیا کے مجموعی تصور سے الگ اور بالکل بے تعلق کر کے یہ اطلاع جو آپ اس کو دے رہے ہیں اِس کو وہ اس مجموعے میں آخر کہاں نصب کرے گا؟ کس طرح آپ ہر طالب علم سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ کائنات اور زندگی کے بے خدا تصور کے ساتھ دینیات کی یہ پوٹلی جو آپ الگ سے اس کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں، اسے وہ کھول کر روز کے روز اپنے دوسرے اجزائے علم کے ساتھ ترکیب دیتا رہیگا اور خود بخود اپنے ذہن میں ایک دوسرا باخدا تصور مرتب کرتا رہے گا؟

پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے قومی خرچ پر جو درس گاہیں قائم کیں ان میں بھی ہم نے وہی سارا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو سرکاری درسگاہوں میں تھا۔ ہم نے

کوشش کی کہ ہمارے طلبہ انگریزی بولیں اور انگریزی لباس پہنیں۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ انگریزی کلچر ہی کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ہم نے کھیلوں میں اور نشست و برخاست میں اور رہنے سہنے میں اور مسائل پر مباحثوں میں، غرض ہر چیز میں یہی کوشش کی کہ ہماری یہ قومی درسگاہیں کسی طرح بھی سرکاری درسگاہوں سے مختلف نہ ہوں۔ بالکل اُسی معیار کے آدمی یہاں سے نکلیں جیسے سرکاری درسگاہوں سے نکلتے ہیں اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ انگریزی معیار کے لحاظ سے سرکاری درسگاہوں سے نکلے ہوئے لوگوں سے کسی طرح بھی کم تر ہیں۔ جب یہ مقصد ہمارے سامنے تھا اور اسی کی خاطر ہم نے پورا فرنگیت کا ماحول طاری کرنے کی کوشش کی، تو اس ماحول کے اندر اسلام کی وہ ذراسی قلم جو ہم نے لگائی وہ آخر اپنا کیا رنگ دکھا سکتی تھی تعلیمی حیثیت سے وہ نہایت کمزور تھی۔ دوسرے کسی نصاب تعلیم سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا جتنے دلائل ایسے ہو سکتے تھے جو خدا پرستی کے لیے کارآمد ہوتے، وہ سارے کے سارے دلائل ہم نے ناخدا پرستی اور ناخداشناسی کے لیے فراہم کر کے دیے۔ اس پر مزید ستم ہم نے یہ کیا کہ اپنے قومی کالجوں میں بھی سرکاری کالجوں کی طرح زندگی کا پورا ماحول اور ذہنی تربیت کا پورا نظام ایسا رکھا جو اسلام کے اس کمزور سے پیوند کے بجائے فرنگیت اور الحاد کے لیے ہی سازگار تھا۔ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس پیوند کو غذا دینے والی ہو، بلکہ ہر چیز عین اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ یہ سب کچھ کر کے ہم اس معجزے کی توقع رکھتے تھے کہ دینیات کی اس تعلیم سے حقیقت میں کوئی دینی جذبہ پیدا ہوگا، کوئی دینی رجحان نشوونما پائے گا، اسلام کی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگی اور ان کے اندر اسلامی کیرکٹر پیدا ہوگا۔ حالانکہ قانونِ فطرت کے مطابق اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا اور یہی عملاً برآمد ہوا کہ جن طلبہ کو اس طریقے سے دینیات کی تعلیم دی گئی ان کی نگاہوں سے دین گر گیا اور ان کی دینی حالت مشن کالجوں اور گورنمنٹ کالجوں کے طلبہ سے بھی زیادہ بدتر ہوگئی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں بالعموم دینیات کا گھنٹہ تفریح اور مذاق کا گھنٹہ رہا ہے اور اس نے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے بجائے رہے سہے ایمان کا بھی خاتمہ کر دینے کی خدمت انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم خود اپنی اولاد کے سامنے اپنے دین کو تمام دوسرے مضامین سے حقیر تر بنا کر پیش کریں گے تو اس کی

کم سے کم سزا جو قدرت کی طرف سے ہمیں ملنی چاہیے وہ یہی ہے کہ ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے ملحد اور زندیق بن کر اٹھیں اور اپنے اُن بزرگوں کو احمق سمجھیں جو خدا اور رسول اور آخرت کو مانتے تھے۔

اصلاح کی غلط تدبیریں یہ نتائج آج سے ۱۷-۱۸ برس پہلے پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو چکے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کے زمانے میں یکایک یہ شور برپا ہوا تھا کہ آخر ہماری قومی درسگاہوں سے ملاحدہ اور الحاد و دہریت کے مبلغین اس کثرت سے کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ شکایت خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں تھی جہاں عام اندازے کے مطابق نوّے فیصدی طلبہ الحاد اور دہریت میں مبتلا تھے۔ جب یہ واقعات پھیلنے شروع ہوئے اور سارے ملک میں اس کے متعلق مضامین لکھے جانے لگے تو ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس نے اس مسئلے پر غور کیا۔ اُس وقت یہ خیال قائم کیا گیا کہ دینیات کے عنصر کو پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ کر دینے سے کام چل جائیگا۔ چنانچہ اس سلسلے میں کچھ اصلاحات تجویز کی گئیں اور کچھ نئے نصاب بھی مرتب کیے گئے۔ لیکن یہ اصلاح کچھ بھی مفید ثابت نہ ہوئی اور اُس وقت سے آج تک صورتِ حال میں کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔

میرا اُسی وقت یہ اندازہ تھا اور میں نے "ترجمان القرآن" میں اسے لکھ بھی دیا تھا کہ ان تدبیروں سے آپ کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ آج میں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ ہمارے اربابِ اقتدار، جن کے ہاتھ میں ہمارا نظامِ تعلیم ہے اور جو وقتاً فوقتاً ہمیں اسلامی نظامِ تعلیم کے قیام کی خوشخبری سناتے رہتے ہیں، اسی غلطی کا پھر اعادہ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر بھی حقیقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہاں وہی پرانا طرزِ تعلیم، جو انگریز کے وقت سے چلا آ رہا ہے، اُسی طرح قائم رہے اور اس کے اندر بس دینیات کے عنصر کو ذرا بڑھا دیا جائے۔ اس لیے جو بات میں نے آج سے چند برس پہلے کہی تھی، آج پھر میں اس کو دہراتا ہوں۔ میرے نزدیک اس سے بڑی دنیا میں کوئی غلطی نہیں ہے کہ کسی نظامِ تعلیم میں دو بالکل متضاد عناصر شامل کر دیے جائیں، ایسے متضاد عناصر جو ایک دوسرے کے ساتھ مزاحمت کرنے والے اور ایک دوسرے کی تردید کرنے والے ہوں۔ اس طرح کی آمیزش فسادِ ذہنی کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

فرض کیجیے کہ اس آمیزے میں آپ نے دینی تعلیم کے عنصر کو پچاس فیصدی کر دیا اور باقی پچاس فی صدی آپ کی تعلیم انہی بنیادوں پر رہی جن پر انگریز یہاں قائم کر گیا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا۔ بلکہ ہر طالب علم کی زندگی ایک رزمگاہ بن جائے گی۔ پھر اگر آپ نے اپنے کالجوں میں، جہاں تک کہ تعلیمی نصاب کا تعلق ہے، دینیات کا عنصر پچاس فی صدی بھی رکھ دیا، مگر سارا تعلیمی ماحول اور آپ کے کالجوں کی ساری فضا ویسی کی ویسی ہی فرنگیانہ رہی جیسی کہ انگریز کے دور میں تھی، اور یہ آپ کی مملکت بھی انہی بنیادوں پر چلتی رہی جن پر انگریز اس کو قائم کر گیا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی درسگاہوں سے تین قسم کے آدمی نکلیں گے۔

ایک قسم کے آدمی تو وہ ہونگے جو دینیات کی تعلیم پانے کے باوجود پھر بھی ملحد ہوں گے، کیونکہ ایک دوسرا مخالف عنصر بھی آپ کے نظامِ تعلیم میں موجود ہوگا اور اس کی پشت پر نہ صرف کالج کے ماحول کی طاقت ہوگی بلکہ آپ کی مملکت کا ماحول بھی اسی کے لیے مددگار ہوگا اور مزید براں دنیا کی طاقتور سلطنتوں کا بین الاقوامی ماحول بھی اسی کے لیے سازگار رہیگا۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہونگے جو دینیات کی تعلیم کا اثر قبول کر کے اسلام ہی کو اپنے دین کی حیثیت سے پسند کریں گے۔

اور تیسری قسم کے لوگ ایسے نکلیں گے جو اسلام اور کفر کے درمیان مذبذب رہیں گے۔ نہ پورے مسلمان ہی ہونگے نہ پورے کافر۔

یہ ہیں اس طرح کی آمیزش کرنے کے لازمی نتائج۔ آپ اگر اس کا تجربہ کریں گے تو خود دیکھ لیں گے کہ اس سے آپ کی قوم میں تین مختلف قسم کے عناصر پیدا ہو جائیں گے جو کسی تہذیب اور کسی نظامِ زندگی کو بھی نشوونما دینے میں یکسوئی کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔ پھر کیا ایک ملک کا نظامِ تعلیم اسی غرض کے لیے بنایا جاتا ہے کہ وہ ملک میں ایک ذہنی کباڑخانہ فراہم کرے؟

ایک انقلابی قدم کی ضرورت | یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے میرا مقصد یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ اگر فی الواقع ہم یہاں ایک اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرتبین اور دماغ دوڑانا

کرنے سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری اُن ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، اور ایک آزاد قوم، اور ایک ترقی کی خواہشمند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔ اسی نظامِ تعلیم کا نقشہ اور اس کے قائم کرنے کا طریقہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مقصد کا تعیّن اس نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل میں اوّلین چیز جسے ہم کو سب سے پہلے طے کرنا چاہیے یہ ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کیا ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد بس علم حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل ایک غیر جانب دارانہ تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل ایک معروضی مطالعہ (Objective Study) کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کر سکیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف فوٹو کے کیمرے کیا کرتے ہیں، انسان نہیں کر سکتے۔ انسان ان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہر حال اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے، زندگی میں اپنا ایک مقصد رکھتا ہے، مسائل کے متعلق سوچنے کا ایک طرز رکھتا ہے اور وہ جو کچھ بھی سنتا ہے، جو کچھ بھی معلومات حاصل کرتا ہے اسے اپنی اُس فکر کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے جو اس کے اندر بنیادی طور پر موجود ہوتی ہے۔ پھر اسی فکر کی بنیاد پر اس کا وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جس کو ہم اس کی کلچر کہتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا ایک نظریۂ زندگی ہے، جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، اور جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے، تو لازماً ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے اُنہی بنیادوں پر اسے ترقی دیں جن پر ہماری کلچر قائم ہے۔ دنیا کی ہر قوم اسی غرض کے لیے اپنا مستقل نظامِ تعلیم قائم کیا کرتی ہے۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں

ہے جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی کے سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔ یہ حماقت اگر پہلے ہم کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے کر رہے تھے تو اب اسے حسبِ سابق جاری رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔ اب تو ہمارا نظامِ زندگی ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔

اب لازماً ہمارے پیشِ نظر تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب کو ——— اور ہماری قومی تہذیب ہمارے دین کے سوا اور کیا ہے؟ لہٰذا ہمارے دین کو ——— اچھی طرح سمجھتے ہوں، اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں، اس کے اصولوں کو ٹھیک جانتے ہوں، اس کے مطابق مضبوط سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق رکھتے ہوں، اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اسی تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔

دین و دنیا کی تفریق مٹا دی جائے دوسری چیز جو ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں بطورِ اصول کے پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور اسی کی بنیاد پر ہمارا سارا نظامِ تعلیم بننا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس دین اور دنیا کی تفریق کو ختم کر دیں۔ دین اور دنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے، یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں، اپنے نظامِ تمدن میں اور اپنے نظامِ مملکت میں اس دین اور دنیا کی تفریق کے تخیل کو قبول کریں۔ ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دنیوی ہو اور ایک تعلیم دینی۔ اس کے برعکس ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری پوری کی پوری تعلیم بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔ دنیوی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو سمجھیں اور دنیا کے کام چلانے کے قابل ہوں۔ اور دینی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو دین ہی کے نقطۂ نظر سے سمجھیں اور دین کی ہدایت کے مطابق اس کا سارا کام چلائیں۔ اسلام وہ مذہب نہیں ہے جو آپ سے یہ کہتا ہو کہ دنیا کے کام آپ جس طرح چاہیں چلاتے رہیں اور بس اس کے ساتھ چند عقائد اور عبادات کا ضمیمہ لگائے رہیں۔ اسلام زندگی کا محض ایک ضمیمہ بننے پر

نہ کبھی قانع تھا اور نہ آج ہے۔ وہ تو پوری زندگی میں آپ کا رہنما اور پوری زندگی کے لیے آپ کا طریقِ عمل بننا چاہتا ہے۔ وہ دنیا سے الگ محض عالمِ بالا کی باتیں نہیں کرتا بلکہ پوری طرح دنیا کے مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ اس دنیا میں آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں۔ آپ کا مقصدِ زندگی کیا ہے۔ کائنات میں آپ کی اصلی پوزیشن کیا ہے۔ اور اس دنیا میں آپ کو کس طریقے سے، کن اصولوں پر کام کرنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت میں جو کچھ بھی آپ کو پھل ملنے والے ہیں وہ اس بات پر منحصر ہیں کہ دنیا کی اس کھیتی میں آپ کیا بوتے ہیں۔ اِس کھیتی کے اندر زراعت کرنا وہ آپ کو سکھاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں آپ کا سارا طرزِ عمل کیا ہو جس کے نتیجے میں آپ کو آخرت کا پھل ملے۔ اس قسم کا ایک دین کیسے یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ آپ کے ہاں ایک تعلیم دنیوی ہو اور دوسری دینی، یا ایک دنیوی تعلیم کے ساتھ محض ایک مذہبی ضمیمہ لگا دیا جائے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری کی پوری تعلیم دینی نقطۂ نظر سے ہو۔ اگر آپ فلسفہ پڑھیں تو دینی نقطۂ نظر سے پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان فلاسفر بن سکیں۔ آپ تاریخ پڑھیں تو ایک مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان مؤرخ بن سکیں۔ آپ سائنس پڑھیں تو ایک مسلم سائنٹسٹ بن کر اٹھیں۔ آپ معاشیات پڑھیں تو اس قابل بنیں کہ اپنے ملک کے پورے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ آپ سیاسیات پڑھیں تو اس لائق بنیں کہ اپنے ملک کا نظامِ حکومت اسلام کے اصولوں پر چلا سکیں۔ آپ قانون پڑھیں تو اسلام کے معیارِ عدل و انصاف پر معاملات کے فیصلے کرنے کے لائق ہوں۔ اِس طرح اسلام دین و دنیا کی تفریق مٹا کر پوری کی پوری تعلیم کو دینی بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کسی جداگانہ مذہبی نظامِ تعلیم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کے یہی کالج آپ کے لیے امام اور مفتی اور علمائے دین بھی تیار کریں گے اور آپ کی قومی حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے سکرٹری اور ڈائرکٹر بھی۔

تشکیلِ سیرت تیسری بنیادی چیز جو نئے نظامِ تعلیم میں ملحوظ رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں تشکیلِ سیرت کو کتابی علم سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ محض کتابیں پڑھانے اور محض علوم و فنون

سکھا دینے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ایک ایک نوجوان کے اندر اسلامی کیریکٹر پیدا ہو، اسلامی سیرت اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو۔ خواہ وہ انجینئر ہو، خواہ وہ سائنٹسٹ ہو، خواہ وہ علومِ عمران کا ماہر ہو، خواہ وہ ہماری سول سروس کے لیے تیار ہو رہا ہو، جو بھی ہو اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کیریکٹر ضرور ہونا چاہیے۔ یہ چیز ہماری تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہونی چاہیے۔ جس آدمی میں اسلامی اخلاق نہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بہر حال ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔

عملی نقشہ ان اصولی باتوں کی وضاحت کے بعد اب میں تفصیل کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ وہ اسلامی نظامِ تعلیم جس کو ہم یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کا عملی نقشہ کیا ہے۔

ابتدائی تعلیم سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کو لیجیے جو اس عمارت کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھائیے جو آج آپ کے پرائمری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں، اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کیے گئے ہیں اور آئندہ کیے جائیں ان سب سے فائدہ اٹھائیے، لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں:

اوّل یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔ اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے خدا کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمراں ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لیے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے لے کر پرائمری اسکول کے آخری مرحلہ تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس ہی اس طرز پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں۔ حتیٰ کہ وہ الف سے ایٹم بم نہ سیکھے بلکہ اللہ سیکھے۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اوّل روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دے گی اور ان کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحل

تعلیم تک جبکہ وہ ڈاکٹر بنیں گے یہی بنیاد اور یہی جڑ کام دیتی رہے گی۔

دوم یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے۔ وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا ہے ان کی قدر اور ان کے لیے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے۔ اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے ان کے لیے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں، جو لوگ بد دیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلے ہیں اور آگے جا کر وہی اپنی قوم کے ساتھ یہ کچھ بے ایمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو طوطے مینا اور گائے بیل کے سبق پڑھائے گئے تھے، اخلاقی سبق نہیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر طالب علم کو جو تعلیم دی جائے اس کے اندر اخلاقی مضامین شامل ہوں۔ اس کے اندر رشوت خوری کے خلاف شدید جذبۂ نفرت ابھارا جائے۔ اس کے اندر حرام طریقوں سے مال کمانے اور کھانے والوں پر سخت تنقید کی جائے اور اس کے برے نتائج بچوں کے ذہن نشین کیے جائیں۔ اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکے اور فریب سے، خود غرضی اور نفس پرستی سے، چوری اور جعل سازی سے، بد عہدی اور خیانت سے، شراب اور سود اور قمار بازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ ان اخلاقی برائیوں کا اثر پائیں اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں۔ یہاں تک کہ انہی درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ داد دینے اور ساتھ دینے والے۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کو درسیات میں بیان کیا جائے، اُن کی طرف رغبت دلائی جائے، اُن کی تعریف کی جائے، ان کے اچھے نتائج تاریخ سے نکال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے ان کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں

حقیقت میں انسانیت کے لیے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دل نشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصلی خوبیاں کیا ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں، اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں ان کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاسِ عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندیٔ حدود کا، اکلِ حلال اور ترکِ حرام کا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا سبق دیا جائے، اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

سوم یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دیے جائیں۔ اس کے لیے اگر ایک الگ دینیات کے کورس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بنایا جا سکتا ہے، لیکن بہرحال صرف اسی ایک کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی بتدریج تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے۔ اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہیے کہ بچہ یہ نہ محسوس کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں، ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لیے ضروری ہے، اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

چہارم یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دیے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی

نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کیا جائے جس سے بچے یہ سمجھیں کہ ہمارے لیے یہی احکام ہونے چاہئیں، یہ احکام بالکل برحق ہیں، اور ہم کو ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے ان احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

ثانوی تعلیم | اس کے بعد اب ہائی سکول کی تعلیم کو لیجیے۔ اس میں سب سے پہلی چیز جسے میں ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کے اصل مآخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے۔ حدیث عربی میں ہے۔ ہمارے ابتدائی صدیوں کے فقہاء اور علماء نے جتنا کام کیا ہے ان کی ساری کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اصل مآخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ پوری طرح سے اس میں اسلامی ذہنیت پیوست ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی چھپیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لیے ہم عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی سکول سے فارغ ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عربی عبارت کو صحیح پڑھ اور سمجھ سکے۔

ثانوی تعلیم کا دوسرا لازمی مضمون قرآن مجید ہونا چاہیے جس کے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ وقت بچانے کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ہائی اسکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان قرآن ہی کے ذریعہ سے پڑھائی جائے۔

تیسرا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہیے جس میں طلبہ کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں، انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے، انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے، ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں، اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے

کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کیے جانے چاہئیں کہ وہ محض باپ داوا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ ان کی اپنی رائے بن جائیں۔

اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات کو بھی ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے اور تاریخ سے نظیریں پیش کر کرکے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور نظریے نہیں ہیں بلکہ عملاً اس سیرت و کردار کے لوگ مسلم سوسائٹی میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے، طلبہ خود ان اوصاف کو برا سمجھیں، ان سے بچیں اور اپنی سوسائٹی میں اُن صفات کے لوگوں کو اُبھرنے نہ دیں۔ اور اسلام جن اوصاف کو محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں، ان کو اپنے اندر نشو و نما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔

میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچّہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ تفصیلی احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اس کو شخصی اور ذاتی زندگی، خاندانی زندگی، اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق اُن تمام ضروری احکام سے واقف ہونا چاہیے جو ایک جوان آدمی کے لیے درکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان احکام کو اتنی تفصیل کے ساتھ جانے کہ مفتی بن جائے لیکن اس کی معلومات اتنی ضرور ہونی چاہئیں کہ وہ اُس معیار کی زندگی بسر کر سکے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہیے۔ یہ کیفیت تو نہ ہو کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی نکاح و طلاق کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا اور بسا اوقات وہ شدید غلطیاں کر جاتے ہیں اور پھر مسئلے پوچھتے پھرتے ہیں۔ یا لین دین کے متعلق معمولی مسائل سے بھی ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور اسلامی احکام کے مطابق چلنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس لیے غلطیاں کرتے ہیں کہ ان کو احکام معلوم نہیں ہوتے۔

تاریخ کی تعلیم میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی اسکول کا ہر طالب علم نہ صرف اپنے

ملک کی تاریخ پڑھے بلکہ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اس کو تاریخ انبیاء سے واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ جان لے کہ اسلام ایک ازلی و ابدی تحریک ہے، ساتویں صدی عیسوی میں یکایک شروع نہیں ہو گئی تھی۔ اس کو سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ اُن مثالی شخصیتوں سے روشناس ہو جائے جو اس کے لیے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک کی تاریخ کا بھی ایک مجمل خاکہ اس کے سامنے آ جانا چاہیے تاکہ وہ یہ جان لے کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں۔ جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی اسکول کے مرحلے میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے۔ مثلاً ہائی سکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہیے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلبہ کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہیے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالب علموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں۔ اور از روئے قاعدہ بھی کوئی ایسا طالب علم مدرسے میں نہ رہ سکے جو مدرسے کے اوقات میں نماز نہ پڑھتا ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ نماز ہی وہ بنیاد ہے جس پر عملاً اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے۔ یہ بنیاد منہدم ہو جانے کے بعد اسلامی زندگی ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لحاظ سے بھی آپ کو سوچنا چاہیے کہ ایک طرف آپ ایک طالب علم کو یہ بتاتے ہیں کہ نماز فرض ہے، یہ خدا نے تجھ پر فرض کی ہے۔ اس کے بعد آپ اپنے عملی برتاؤ سے روزانہ یہ بات اس کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اس فرض کو فرض جانتے اور مانتے ہوئے بھی اگر تو ادا نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ اسے روزانہ منافقت کی اور ڈیوٹی سے فرار کی اور ضعف سیرت کی مشق کرا رہے ہیں۔ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ یہ تعلیم و تربیت پاکر جب وہ نکلے گا تو آپ کے تمدن اور آپ کی ریاست کا ایک فرض شناس کارکن ثابت ہوگا؟ جی نہیں، ایک فرض کی چوری میں مشاق ہو کر وہ پھر دوسرے فرائض میں سے چرائے گا۔ اسٹیٹ کے فرائض میں

سے چرائے گا۔ سوسائٹی کے فرائض ہیں سے چرائے گا۔ ہر فرض کے اندر سے کچھ نہ کچھ چوری کرکے رہیگا۔ اس صورت میں آپ کو اسے ملامت نہ کرنی چاہیے بلکہ اس نظام تعلیم کو ملامت کرنی چاہیے جس نے اوّل روز سے اس کو یہ سکھایا تھا کہ فرض ایک ایسی چیز ہے جس کو فرض جاننے کے بعد بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ اپنے نوجوانوں کو خدا سے بے وفائی سکھانے کے بعد آپ یہ ہرگز امید نہ رکھیں کہ وہ قوم، ملک، ریاست، کسی چیز کے بھی مخلص اور وفادار ہونگے۔ تعلیم کے کورس میں بلند خیالات اور معیاری اوصاف بیان کرنے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے اگر سیرت و کردار کو ان خیالات اور معیارات پر قائم کرنے کی عملاً کوشش نہ کی جائے۔ دل میں اونچے خیالات رکھنے اور عمل ان کے خلاف کرنے سے رفتہ رفتہ سیرت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو جاتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی سیرت ہی بودی اور کھوکھلی ہو وہ مجرّد اپنی ذہنی اور علمی قابلیتوں سے کوئی کارنامہ کرکے نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ہمیں ثانوی تعلیم کے مرحلے میں، جبکہ نئی نسلیں بچپن سے جوانی کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ایک ایک لڑکے اور لڑکی کے اندر مضبوط سیرت پیدا کریں اور انہیں یہ سکھائیں کہ تمہارا عمل تمہارے علم کے مطابق ہونا چاہیے۔ جس چیز کو حق جانو اس کی پیروی کرو۔ جسے فرض جانو اسے ادا کرو۔ جسے بھلائی جانو اسے اختیار کرو۔ اور جسے برا جانو اسے ترک کر دو۔

اعلیٰ تعلیم اس کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کی طرف آتا ہوں۔ اس تعلیم میں ہم چاہتے ہیں کہ ایک عام نصاب ہو اور ایک خاص نصاب۔ عام نصاب سے میری مراد ایسا نصاب ہے جو تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو، خواہ وہ کسی مضمون کی تعلیم پا رہے ہوں، لازماً پڑھایا جائے۔ اور خاص نصاب کا مطلب وہ نصاب ہے جو ہر مضمون کے طالب علم کو اس کے مضمون کی مناسبت سے پڑھایا جائے۔

عام نصاب میں میرے نزدیک تین چیزیں شامل ہونی چاہئیں:

(۱) قرآن مجید، جسے اس طرح پڑھایا جائے کہ ایک طرف طلبہ قرآن کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہو جائیں، اور دوسری طرف ان کی عربی اس حد تک ترقی کر جائے کہ وہ قرآن کو ترجمے کے بغیر اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

(۲) حدیث کا ایک مختصر مجموعہ جس میں وہ احادیث جمع کی جائیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر، اس کی اخلاقی تعلیمات پر، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ترجمے کے بغیر ہونا چاہیے تاکہ طلبہ اس کے ذریعہ سے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان دانی میں بھی ترقی کر سکیں۔

(۳) اسلامی نظام زندگی کا ایک جامع نقشہ، جس میں اسلام کی اعتقادی بنیادوں سے لے کر عبادات، اخلاق، معاشرت، تہذیب و تمدن، معیشت، سیاست، اور صلح و جنگ تک ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ معقول اور مدلّل طریقے سے بیان کیا جائے، تاکہ ہمارا ہر تعلیم یافتہ نوجوان اپنے دین کو اچھی طرح سمجھ لے، اور جس شعبہ زندگی میں بھی وہ آگے کام کرے اس میں وہ اسلام کی اسپرٹ اس کے اصول اور اس کے احکام کو ملحوظ رکھ کر کام کر سکے۔

خاص نصاب ہر مضمون کی کلاسوں کے لیے الگ تیار کیا جائے اور وہ صرف اسی مضمون کے طلبہ کو پڑھایا جائے۔ مثلاً:

جو طلبہ فلسفہ لیں ان کو دوسرے فلسفیانہ نظاموں کے ساتھ اسلامی فلسفہ بھی پڑھایا جائے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اسلامی فلسفے سے مراد وہ فلسفہ نہیں ہے جو مسلمانوں نے ارسطو اور افلاطون اور فلاطینوس وغیرہ سے لیا اور پھر اس کو انہی خطوط پر آگے بڑھایا۔ اور اس سے مراد وہ علم کلام بھی نہیں ہے جسے یونانی منطق و فلسفہ سے متأثر ہو کر ہمارے متکلمین نے اس غرض کے لیے مرتب کیا تھا کہ اسلامی حقائق کو اپنے وقت کے فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں اور منطق کی زبان میں بیان کریں۔ یہ دونوں چیزیں اب صرف اپنی ایک تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ انہیں پڑھانا ضرور چاہیے مگر اس حیثیت سے کہ یہ تاریخ فلسفہ کے دو اہم ابواب ہیں جن کو مغربی مصنفین بالعموم نظر انداز کر کے طالبان علم کے ذہن پر یہ اثر جماتے رہے ہیں کہ دنیا کے عقلی ارتقاء میں قدیم یونانی فلاسفہ سے لے کر آج تک جو کچھ بھی کام کیا ہے صرف یورپ کے لوگوں نے کیا ہے۔ لیکن مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کا یہ کام نہ "اسلامی فلسفہ" تھا، اور نہ اسے اس نام سے آج ہمیں اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہیے، ورنہ یہ سخت

غلط فہمی کا، بلکہ گمراہی کا موجب ہوگا۔" اسلامی فلسفہ" دراصل کہیں مرتب شدہ موجود نہیں ہے بلکہ اسے اب نئے سرے سے اُن بنیادوں پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہمیں قرآن میں ملتی ہیں۔ قرآن مجید ایک طرف انسانی علم و عقل کے حدود بتاتا ہے۔ دوسری طرف وہ محسوسات کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ تیسری طرف وہ منطق کے ناقص طرزِ استدلال کو چھوڑ کر عقلِ عام کے مطابق ایک سیدھا سادھا طریقِ استدلال بتاتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ وہ ایک پورا نظریۂ کائنات و انسان پیش کرتا ہے جس کے اندر ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ان بنیادوں پر ایک نیا فنِ استدلال، ایک نیا طریقِ تفلسف، ایک نیا فلسفۂ مابعد الطبیعت، ایک نیا فلسفۂ اخلاق، اور ایک نیا علم النفس مرتب کیا جا سکتا ہے، جسے اب مرتب کرانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہمارے فلسفے کے طلبہ فلسفۂ قدیم و جدید کی بھول بھلیاں میں داخل ہو کر پھنسے کے پھنسے نہ رہ جائیں بلکہ اس سے نکلنے کا راستہ بھی پالیں اور دنیا کو ایک نئی روشنی دکھانے کے قابل بن سکیں۔

اسی طرح تاریخ کے طلبہ کو دنیا بھر کی تاریخ پڑھانے کے ساتھ اسلامی تاریخ بھی پڑھائی جائے، اور فلسفۂ تاریخ کے دوسرے نظریات کے ساتھ اسلام کے فلسفۂ تاریخ سے بھی روشناس کیا جائے۔ یہ دونوں مضمون بھی ذرا تشریح طلب ہیں، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں جو عام غلط فہمیاں موجود ہیں ان کی وجہ سے میرا مدعا آپ کے سامنے واضح نہ ہوگا۔ اسلامی تاریخ کا مطلب بالعموم مسلمان قوموں اور ریاستوں کی تاریخ، یا ان کے تمدن اور علوم و آداب کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسلامی فلسفۂ تاریخ کا نام سن کر ہر ایک طالب علم ابن خلدون کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ میں علمِ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان دونوں چیزوں کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کرتا، نہ یہ کہتا ہوں کہ یہ چیزیں پڑھائی نہ جائیں۔ مگر میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ دو الگ چیزیں ہیں۔ اسلامی تاریخ کا اطلاق دراصل جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کے دوران میں اسلام کے ان اثرات کا جائزہ لیا جائے جو مسلمان ہونے والی قوموں کے خیالات، علوم، آداب،

اخلاق، تمدن، سیاست، اور فی الجملہ پورے اجتماعی طرزِ عمل پر مترتب ہوئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان اثرات کے ساتھ دوسرے غیر اسلامی اثرات کی آمیزش کس کس طرح ہوتی رہی ہے اور اس آمیزش کے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اسی طرح اسلامی فلسفۂ تاریخ سے مراد درحقیقت قرآن کا فلسفۂ تاریخ ہے جس میں وہ ہمیں انسانی تاریخ کو دیکھنے کے لیے ایک خاص زاویۂ نگاہ دیتا ہے، اس سے نتائج اخذ کرنے کا ایک خاص ڈھنگ بتاتا ہے اور قوموں کے بننے اور بگڑنے کے اسباب پر مفصل روشنی ڈالتا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلامی فلسفے کی طرح اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفۂ تاریخ پر بھی اس وقت تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے جو نصاب کے طور پر پڑھائی جاسکے۔ ان دونوں موضوعات پر اب کتابیں لکھنے اور لکھوانے کی ضرورت ہے تاکہ اُس خلا کو بھرا جاسکے جو ان کے بغیر ہماری تعلیمِ تاریخ میں رہ جائے گا۔

جہاں تک علومِ عمرانی کا تعلق ہے، ان میں سے ہر ایک میں اسلام کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے، اور ہر ایک میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتا ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی تعلیم میں اُس علم سے متعلق اسلامی تعلیمات کو بھی لازماً شامل ہونا چاہیے۔ مثلاً معاشیات میں اسلامی اصولِ معیشت، اور سیاسیات میں اسلام کا سیاسی نظریہ اور نظام، وغیرہ۔ رہے فنی علوم، مثلاً انجینئرنگ، طب اور سائنس کے مختلف شعبے، تو ان سے اسلام بحث نہیں کرتا، اس لیے ان میں کسی خاص اسلامی نصاب کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے لیے وہی عام نصاب اور اخلاقی تربیت کافی ہے جس کا ابھی اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں۔

اختصاصی تعلیم | اعلیٰ تعلیم کے بعد اختصاصی تعلیم کو لیجیے جس کا مقصود کسی ایک شعبۂ علم میں کمال پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں جس طرح ہمارے ہاں دوسرے علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، اسی طرح اب قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے علومِ اسلامیہ کی اختصاصی تعلیم کا بھی ہونا چاہیے تاکہ ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے مفسر، محدث اور فقیہ اور علمائے دین پیدا ہو سکیں۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، اس کی تعلیم تو میرے خیال میں ہمارے لا کالجوں میں ہونی چاہیے

کیونکہ اب انشاء اللہ اسلام کا قانون ہی ہمارے ملک کا قانون بن کر رہے گا، اور اس صورت میں یہاں کے لا کالجوں کو یہی قانون پڑھانا ہوگا۔ اس کے لیے ہم کو تعلیم کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اس مسئلے پر اس سے پہلے میں اپنے دو لکچروں میں مفصل بحث کر چکا ہوں جو ۱۹۴۸ء میں لا کالج لاہور میں ہوئے تھے، اس لیے یہاں اس کا اعادہ نہ کروں گا[1]۔ رہے قرآن و حدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ، تو ان کی اختصاصی تعلیم کے لیے ہماری یونیورسٹیوں کو خاص انتظامات کرنے ہوں گے جن کا مختصر خاکہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

میرے خیال میں اس مقصد کے لیے ہمیں مخصوص کالج قائم کرنے ہوں گے جن میں صرف گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ داخل ہو سکیں۔ ان اداروں میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہیے:

(۱) عربی ادب، تاکہ طلبہ میں اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے اور اس کے ساتھ وہ عربی زبان لکھنے اور بولنے پر بھی قادر ہوں۔

(۲) علوم قرآن، جن میں پہلے اصول تفسیر، تاریخ علم تفسیر اور فن تفسیر کے مختلف اسکولوں کی خصوصیات سے طلبہ کو آشنا کیا جائے، اور پھر قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرایا جائے۔

(۳) علوم حدیث، جن میں اصول حدیث، تاریخ علم حدیث اور فن جرح و تعدیل پڑھانے کے بعد حدیث کی اصل کتابیں ایسے طریقے سے پڑھائی جائیں کہ طلبہ ایک طرف خود احادیث کو پرکھنے اور ان کی صحت و سقم کے متعلق رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں، اور دوسری طرف حدیث کے بیشتر ذخیرے پر ان کو نظر حاصل ہو جائے۔

(۴) فقہ، جس کی تعلیم لا کالجوں کی تعلیم فقہ سے ذرا مختلف ہو۔ یہاں صرف آشنا کافی ہے کہ طلبہ کو اصول فقہ، تاریخ علم فقہ، مذاہب فقہیہ کی امتیازی خصوصیات، اور قرآن و حدیث کے نصوص سے استنباط احکام کے طریقے اچھی طرح سمجھا دیے جائیں۔

(۵) علم العقائد، علم کلام اور تاریخ علم کلام جسے اس طریقے سے پڑھایا جائے کہ طلبہ اس علم کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور متکلمین اسلام کے پورے کام پر ان کو جامع نظر حاصل ہو جائے

[1] یہ لکچر علیحدہ ایک پمفلٹ کی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) تقابلِ ادیان، جس میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تعلیمات سے، ان کی امتیازی خصوصیات سے، اور ان کی تاریخ سے طلبہ کو آشنا کیا جائے۔

اس تعلیم سے جو لوگ فارغ ہوں، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ آپ ان کی ڈگری کا نام کیا رکھیں، مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں آئندہ انہی لوگوں کو "علمائے دین" کہا جانا چاہیے جو اس ڈگری کو حاصل کریں، اور ان کے لیے اُن تمام اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں جو دوسرے مضامین کے ایم اے اور پی ایچ ڈی حضرات کو مل سکتی ہیں۔

لازمی تدابیر حضرات! یہ ہے میرے نزدیک اُس نظامِ تعلیم کا نقشہ جو موجودہ مذہبی تعلیم اور دنیوی تعلیم کے نظام کو ختم کر کے اس ملک میں قائم ہونا چاہیے۔ مگر میں اپنے موضوعِ تقریر کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کروں گا اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہ عرض کر دوں کہ یہ ساری گفتگو قطعی لاحاصل ہے جب تک کہ ہم اپنے پورے تعلیمی انتظامات کو بالکل اوور ہال کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو اسلامی فکر رکھتے ہوں، اسلامی نظامِ تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا چاہتے بھی ہوں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے نہ کہ اُن لوگوں کے ہاتھوں جو نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اس کے نظامِ تعلیم کو، اور نہ اس کے قیام کی کوئی خواہش ہی دل میں رکھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر زمامِ کار پر قابض رہیں اور پھر ہم رات دن کی چیخ پکار سے دباؤ ڈال کر ان سے یہ کام زبردستی کراتے رہیں، تو بادلِ ناخواستہ وہ کچھ اسی طرح کی ادھوری اصلاحات کرتے رہیں گے جیسی آج کل ہو رہی ہیں، اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لیے معلّمین اور معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیں اور آئندہ کے لیے معلّمین کی ٹریننگ میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔ جو شخص تعلیم کے معاملہ میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ نظامِ تعلیم میں نصاب اور اس کی کتابوں سے بڑھ کر استاد اور اس کا کیرکٹر اور کردار زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی

اور اخلاقی تربیت نہیں دے سکتے جو ہمیں اپنے نئے نظامِ تعلیم میں مطلوب ہے۔ دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی میں نوبگڑے ہوئے کارکن زیادہ تر موجودہ نسل ہی کو بگاڑتے ہیں، مگر نظامِ تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا بھی ناس کر دیتے ہیں جس کے بعد مستقبل میں بھی کسی صلاح و فلاح کی امید باقی نہیں رہتی۔

آخری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم گاہوں کے پورے ماحول کو بدل کر اسلام کے اصول اور اسپرٹ کے مطابق بنانا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہر، یہ از فرق تا بقدم مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ، یہ کالجوں کے مباحثے اور انتخابات کے طریقے، اگر آپ کے ہاں یونہی جاری رہیں، اور ان میں سے کسی چیز کو بھی آپ بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں، تو پھر ختم کیجیے اسلامی نظامِ تعلیم کی اس ساری گفتگو کو، اور بند کیجیے اسلام اسلام کی یہ رٹ۔ اس آب و ہوا میں اسلام کا تخم ہرگز جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ اس کو برقرار رکھتے ہوئے اسلامی نظامِ تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش اس سے زیادہ احمقانہ کوشش ہے جتنی ایک سیم زدہ زمین میں زراعت کرنے کی کوشش احمقانہ ہو سکتی ہے۔ ایک طرف آپ اسلام کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے جوان لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ لا کر بٹھاتے ہیں، اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ انہی لڑکوں اور لڑکیوں میں اسلام اور اس کے احکام کا احترام پیدا ہو۔ ایک طرف آپ اپنی تمام حرکات و سکنات اور اپنے پورے ماحول سے اپنی نئی نسلوں کے ذہن پر فرنگی تہذیب و تمدن اور فرنگی طرزِ زندگی کا رعب بٹھاتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ زبانی باتوں سے ان کے دلوں میں اپنی قومی تہذیب کی قدر پیدا ہو جائے۔ ایک طرف آپ اپنے مباحثوں میں روز اپنے نوجوانوں کو زبان اور ضمیر کا تعلق توڑنے اور ضمیر کے خلاف بولنے کی مشق کراتے ہیں، اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ ان کے اندر راستبازی اور حق پرستی پیدا ہو۔ ایک طرف آپ ان کو وہ سارے انتخابی ہتھکنڈے اپنے کالجوں ہی میں برتنے کا خوگر بناتے ہیں جنھوں نے ہماری پوری سیاسی زندگی کو گندا کر کے رکھ دیا ہے، اور دوسری طرف آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہاں سے نکل کر وہ آگے بڑے ایماندار اور کھرے ثابت ہوں گے۔ یہ متضاد باتیں صحیح العقل لوگوں کے کرنے کی نہیں ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو نظامِ تعلیم کی بات کرنے سے پہلے اپنے دماغ کے علاج کی فکر کرنی چاہیے۔